⊙ ڈاکٹر یاسمین کوثر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ
⊙⊙ ڈاکٹر صنم شاکر
صدر، شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی (رحیم یار خان کیمپس)
⊙⊙⊙ ڈاکٹر ارم صبا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کی ذہنی ہم آہنگی

Abstract:

Sir Syed Ahmed Khan and Allama Iqbal are great leaders of Indian Muslims. They were the pioneers of the freedom movement of sub-continent. Both visited abroad and their Intellectual thinking was similar. They believed in "Two Nations Theory" and were convinced that the solution of Indian Muslim's problems was in a separate country consisting of Muslim majority provinces and states of India, where they will be free to practice Islam and to achieve this destiny they encouraged Muslims of India to embrace modern education in addition to the Islamic Education. In 1903 Iqbal wrote the poem "Syed ki Lohe Turbat" which reveals his relations with Sir Syed. Since his early days Iqbal was influenced by Sir Syed Ahmed's movement and later, he participated and completed Sir Syed's mission by his tireless efforts.

Keywords:

Allama Iqbal, Sir syed Ahmed Khan, Leader, Freedom Movement, Poetry

جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد حالات جس تیزی سے بگڑے۔ ان سے سر سید احمد خاں کی شخصیت میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندو اور انگریز مل کر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اور اس ہنگامے کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے

دفاع کی خاطر اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شبانہ روز کاوشیں شروع کر دیں۔ ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' تحریر کیا۔ اور اپنی تحریروں سے اس مشن میں دن رات کام کرنے لگے۔ آغاز میں تو سرسید تنہا تھے۔ آہستہ آہستہ یہ کارواں تعداد میں بڑھتا گیا۔ اور ایک تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ ''سرسید کی قیادت ہماری نشاۃ الثانیہ کی تمہید ہے۔''(۱) اقبال نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی۔ وہ سرسید کی تحریک اور ان کی سیاسی وادبی جدوجہد کا دور تھا۔ جس سے ہر ذی شعور تعلیم یافتہ شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اقبال کے نامور استاد سید میر حسن، سرسید کے پرجوش حامی تھے(۲)۔ اقبال بھی اپنے استادِ محترم سے یقیناً اس پہلو میں متاثر ہوئے۔ اقبال اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے۔ سرسید ان کے لیے ایک بڑے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے بھی سرسید کے افکار وخیالات سے اثرات قبول کیے، ان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا اور انھی بنیادوں پر انھوں نے ایک ایسی عمارت تعمیر کی جوان کی زندگی ہی میں ہمدوشِ ثریا نظر آنے لگی۔ سوائے اقبال کے کسی دوسرے شاعر اور فن کار کو یہ مرتبہ نصیب نہیں ہوا کہ اس کا کلام گھر گھر پڑھا جائے، اور اس کے فکری نظام اور شعر وادب سے نہ صرف عام مسلمان بلکہ بڑے بڑے سیاسی رہنما تک متاثر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ اقبال کی تقریباً نصف صدی کا زمانہ ایسا ہے جس کے لیے صرف عہدِ اقبال ہی کی اصطلاح استعمال ہونی چاہیے۔''(۳)

سرسید احمد خاں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ان مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام میں ہے۔ یہی خیالات دوقومی نظریے کی بنیاد بنے۔ اقبال بھی اس نظریے کے زبردست حامی تھے۔ وہ خطبہ الٰہ آباد(۱۹۳۰ء) میں فرماتے ہیں:

> ''میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوگئی ہے کہ ہندوستان کے لسانی اور عقائد ومعاشرت کے بے شمار اختلافات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔''(۴)

اقبال نے سرسید کے مشن کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے تقویت بھی دی۔ دونوں رہنما مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لیے تعلیم کو بنیادی حیثیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مغرب کے جدید علوم وفنون کے حصول سے ترقی کی راہیں کھولی جا سکتی تھیں۔ اس کے ساتھ اسلام کی تعلیم مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل قرار دی گئی۔ خاص طور پر مدرسوں میں فرسودہ نظامِ تعلیم جاری تھا۔ مذہب کو سائنس کے قریب لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اسلام تو دینِ فطرت ہے۔ جس کا صحیح طور پر بغور مطالعہ کیا جائے تو دونوں میں بہت کم اختلاف نظر آئے گا۔ اسلام کی وہ باتیں جنھیں آج ہزاروں سال بعد سائنس تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے اسلام کی سچائی ثابت ہو جاتی ہے۔ سرسید احمد خان نے انگلستان جا کر وہاں کے نظامِ تعلیم کا بغور جائزہ لیا۔ ان کے نظام کی خامیوں کو بھی دیکھا۔ اس لیے مغرب کی اندھی تقلید کے خلاف تھے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں، سرسید کا نظریہ یہ تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونے پر ایک اعلیٰ درجے کی مرکزی درس گاہ کا قیام قومی ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے (۵)۔ انگلستان سے وطن واپسی پر سرسید نے کچھ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جو جدید علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ اسلام کو بھی فروغ دینے میں کوشاں رہے۔ سرسید کے ان عظیم ارادوں کی عملی تفسیر میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جس کی بنیاد ایک سکول سے رکھی گئی تھی۔ مختلف علاقوں میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ سرسید کے ان مقاصد کو پروان چڑھانے میں اقبال کا نام سرِ فہرست ہے۔

علامہ اقبال نے یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران مغربی معاشرے اور ان کے نظامِ تعلیم کا بغور جائزہ لیا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آشنا ہوئے۔ اقبال کوئی ماہرِ تعلیم نہ تھے، لیکن کچھ عرصہ تدریس سے بھی وابستہ رہے تو انھیں ہندوستان کے نظامِ تعلیم کی خامیوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلام کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو بھی حاصل کریں۔ تا کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ ترقی یافتہ قوموں کی طرح تیزی سے ترقی کریں۔ اپنے مسائل حل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوں۔ اقبال کے ان نظریات کو ان کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے:

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دوکفِ جو (۶)

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا (۷)

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت (۸)

اقبال بھی سرسید کی طرح تعلیم میں دین و دنیا کے مناسب امتزاج کے خواہاں تھے۔ تا کہ مسلمان دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ اس کے لیے وہ اجتہاد کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی اصولوں اور قوانین کی تجدید کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اسلام کے قوانین کو فرسودہ قرار دے کر ترک کر دیا جائے گا۔ وقت کی ضرورت یہی ہے کہ زمانے اور حالات کے بدلنے سے اسلام کو بھی جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اقبال اسلام کی اصل روح کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ جس سے مسلمانوں نے کئی سو سال تک حکومت کی۔ سرسید احمد خان نے ''تفسیر القرآن'' لکھی۔ جس میں تفسیر کے اصول، طریق کار پرانی روایتی تفاسیر سے مختلف ہیں۔ اس میں دینی بحثوں کو عقلی سمت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے دینی حلقوں میں کچھ لوگ ان کی مخالفت بھی کرنے لگے۔

علمائے سہارن پور نے سرسید کی مخالفت کی تو اقبال نے کہا کہ علمائے سہارن پور نے یہ نہیں سوچا کہ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، ''تہذیب الاخلاق'' نکالا، علی گڑھ کالج قائم کیا یا مسائل الٰہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا! یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو۔ وہ ایک قوم ہیں (۹)۔ سرسید نے خوب سمجھ لیا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے

تمام مسائل کا حل ان کی جداگانہ قومیت کے تسلیم کرنے میں ہے۔

جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں نے طرح طرح کے مسائل کھڑے کر دیے۔ جن میں سے ایک مسئلہ اُردو ہندی تنازعہ کا تھا۔ ہندو اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے تھے اور اس کی مخالفت سے دراصل وہ مسلمانوں کے دین اسلام اور ثقافت سے دشمنی اور دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ اقبال بھی انھی حالات میں فکری ارتقا کی منازل طے کر رہے تھے۔ اقبال نے سرسید کے مشن کو اپنی شاعری کے ذریعے مزید کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ جس میں بہت کامیاب رہے۔ سرسید کی تحریک کو اقبال کی تحریک نے رکنے نہیں دیا بلکہ اسے مزید تقویت دی۔ اس میں اقبال نے اپنا رنگ بھر کے مزید بہتر کر کے مسلمانوں کے مسائل کے حل پر زور دیا۔ اقبال نے نوجوانوں کو اپنی اس تحریک کا ہراول دستہ بنایا۔ جن کے ہاتھ میں مستقبل کی باگ ڈور تھی۔ اقبال نے مسلمانوں کو اتحاد اور محبت و خلوص کا درس دیا:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں(۱۰)

سرسید احمد خاں نے اُردو ادب کو مقصدیت سے روشناس کرایا۔ ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کو اہمیت دی۔ ادب کو صرف ہوا و ہوس، ہنسی کھیل اور بناوٹ کی بجائے مقصدیت سے متعارف کرایا۔ ادب سے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کا کام لے کر دکھایا۔ سرسید نے اپنے ساتھیوں سمیت اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ سرسید تحریک نے ادب کو نیا رجحان دیا۔ جس کا اثر معاصرین پر بھی ہوا اور آنے والی نسلوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''آج بھی ان کے اثرات ہمارے خون کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو ادب کو محدود دائرے سے نکال کر ایک قومی چیز بنا دیا۔ اور ادب کو مقصد سے مالا مال کر کے زندگی سے اس کا ان مٹ رشتہ جوڑ دیا''۔(۱۱)

علامہ اقبال نے بھی جو شاعری یا نثر تحریر کی اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ برصغیر اور دنیا کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ان کا درخشندہ ماضی یاد کروا کر حال کو درست کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کمزوریوں کو دور کر کے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی نصیحت کرتے۔ اسلام سے دوری سے جو مسائل پیدا ہوئے ان سے روشناس کرایا۔ یہ واضح کیا کہ قرآن کی تعلیمات پر عمل کر کے ہم کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک اور کمزوری اتحاد کی کمی تھی۔ جس سے اس کا دشمن فائدہ اُٹھا کر انھیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ اقبال کی شاعری کا ایک خاص مقصد مسلمانوں کو غلامی کی زنجیروں سے آزادی دلانا تھا۔ اقبال خود کو شاعر بھی تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ وہ سید سلیمان ندوی کو بھوپال سے ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں، اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب

تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں۔
جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار
کر لیا ہے۔''(۱۲)

اقبال نے سید سلیمان ندوی کو لاہور سے ۱۰ ار اکتوبر ۱۹۱۹ء میں ایک اور خط میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ
کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔''(۱۳)

سرسید اور اقبال دونوں کے دلوں میں مسلمانوں کا درد تھا۔ وہ اسلام کی سربلندی چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا وقار واپس دلانے کے لیے بے لوث خدمات سرانجام دیں۔ مسلمانوں کو غلامی سے آزادی دلانا ان کا اولین مقصد تھا۔ ان عظیم مقاصد کی خاطر انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مخالفین نے مخالفت کی حد کر دی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس جدوجہد میں مدد کی۔ سرسید کو اس تحریک کے تحت بہت سے ایسے مخلص ساتھی میسر آئے جو مشکل گھڑیوں میں ان کا دستِ راست بنے۔ سرسید تحریک کے ارکانِ خمسہ کو کون نہیں جانتا۔ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد وغیرہ نے علمی و ادبی اور دینی و تاریخی میدانوں میں یادگار تصانیف پیش کیں۔ جو اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان شخصیات کی حمایت اور پیروی میں اور لوگوں نے بھی نہ صرف ان کا ہاتھ بٹایا بلکہ اس تحریک کے لیے تقویت و سربلندی کا باعث بنے۔ علامہ اقبال کے ذہنی اور فکری ارتقا میں سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک نے بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اقبال نے چند پہلوؤں میں سرسید سے اختلاف کیا لیکن زیادہ تر وہ ان کے خیالات سے متاثر تھے۔

سرسید کے خطوط اور مضامین وغیرہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو مزاح کا بھی ہے۔ دوست احباب کے خطوں میں ان کے لطائف اور مزاحیہ واقعات مل جاتے ہیں۔ اقبال کے خطوط اور تحریروں میں بھی یہ پہلو نمایاں ہے۔ دونوں شخصیات کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حسِ مزاح بھی نظر آتی ہے۔ جو اِن کی تحریروں میں دلچسپی مزہ اور دل کشی پیدا کرتی ہے۔ یہ چیز دکھوں اور تکلیفوں میں معتدل اور متوازن زندگی گزارنے کا درس دیتی ہے۔ سرسید کے مضامین میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ بہر حال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور ان کو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ان کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا(۱۴)۔
محمد اسماعیل پانی پتی ''مقالاتِ سرسید'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے اور سب سے اعلیٰ مضمون نگار تھے۔ اور انھوں
نے اپنی زندگی میں سیکڑوں مضامین اور طویل مقالے بڑی تحقیق و تدقیق، بڑی محنت و کاوش
اور بڑی لیاقت و قابلیت سے لکھے۔''(۱۵)

علامہ اقبال تو سرسید کی شخصیت سے اتنے متاثر تھے کہ ایک دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میرا تو جی چاہتا تھا کہ سید احمد بریلوی اور سید احمد دہلوی کی روحوں کو بھی ''جاوید نامہ'' میں جمع کر دوں(۱۶)۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل:

''اپنی حکمت کے مطابق اقبال کو سید احمد خاں کے نظامِ فکر و عمل میں قدر مشترک نظر آتی تھی وہ ان

کی اصلاح وتجدید کی مساعی تھیں۔ وہ اسلام کی روح کواپنے زمانے کے تقاضوں اورضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کے لیےکوشش کرتے رہے۔''(۱۷)

سرسیداحمد خان دنیا سے رخصت ہوگئے، لیکن ان کی پیروی میں ارکانِ خمسہ کے علاوہ اورخاصی تعداد ایسے ادیبوں اور دیگر لکھنے والوں کی رہی جنھوں نے اس سلسلے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ان میں اقبال کا نام سرِفہرست ہے۔

''مخزن''، جنوری۱۹۰۳ء کے شمارے میں اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت'' چھپی۔اب یہ نظم ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔غلام رسول مہر ''بانگِ درا'' کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سیداحمد خاں وہ بزرگ رہنما تھے جنھوں نے زوالِ حکومت کے بعد مسلمانوں کی مستقل ملی ہستی کی بنیاد رکھی اورقومی زندگی کے احیا کا وہ کارنامہ انجام دیا جس کی بدولت مسلمان اس سرزمین میں اعزاز واکرام کے بلند رتبے پر پہنچے۔سید مرحوم مسلمانوں کے شہرہ آفاق رہنما، مصلح اور مدبر تھے۔مسلمانوں میں جدید تعلیم کا آغاز انھیں نے کیا۔علی گڑھ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھے گا۔قومی اصلاح میں عزیمت کا جو مقام انھیں حاصل ہوا، وہ کسی دوسرے رہنما کے حصے میں نہ آیا۔''مخزن'' نے یہ نظم شائع کرتے وقت مندرجہ ذیل تمہیدی نوٹ لکھا تھا:

''تخیل کے کانوں نے سرسید مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پردرد سُنی، جس کی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا، توقع ہوسکتی تھی۔خوبی یہ ہے کہ سرسید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔اسی طرح اس کی لوحِ تربت سے وہ کلماتِ نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اورجن سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوسکتے ہیں۔اس زمانے میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زوروشور سے ہورہے ہیں۔ان کا شائع ہونا ایک لطفِ مزید رکھتا ہے۔''(۱۸)

علامہ نے اس نظم میں سرسید کی روح سے قبر پرآنے والوں کو وعظ ونصیحت کی ہے اورآنے والے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سرسید کے پیغام کو اقبال نے روح کی زبانی پیش کیا ہے۔اقبال دراصل سرسید کے پیغام اورمقاصد سے بہت متاثر تھے۔جس کا ثبوت یہ نظم ہے۔اقبال نے سرسید کے پیغام کو اپنا رنگ چڑھا کر منفرد انداز سے پیش کیا۔ان کی شاعری کی گہرائی اوراس کے فکروفن نے بامِ عروج پر پہنچایا۔

اقبال ایک طرف تو سید جمال الدین افغانی کے معتقد تھے تو دوسری طرف سرسید احمد خان کی خدمات اورعظمت کے معترف تھے۔دونوں میں جو اساسی قدر مشترک تھی وہ اصلاح وتجدید کی مساعی تھی۔دونوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔وہ مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلا کر الگ وطن دلانا چاہتے تھے۔اوراسلام کی رو سے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مسائل کے حل کے لیے اجتہاد پر زوردیا۔اقبال مسلمانوں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر روشن مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔سرسید سے اقبال کی محبت اور ذہنی وابستگی کا ایک واقعہ اس خط میں ہے جو اقبال نے لاہور سے ۱۳/جون ۱۹۳۶ء میں پروفیسر محمد الیاس برنی کے نام تحریر کیا:

''۳ اپریل کی رات،۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسید علیہ الرحمۃ کو

خواب میں دیکھا، پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر، جواب طویل ہوگئی ہے۔ میری زبان پر جاری ہوگئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔''**(۱۹)**

علامہ اقبال، مولوی عبدالحق کو لاہور سے ۲۷ رستمبر ۱۹۳۶ء کو خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اسی تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔''**(۲۰)**

اقبال کی سر سید سے محبت اور وابستگی صرف ان کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ یہ اگلی نسل تک سلسلہ چلا۔ سر سید کے پوتے سر راس مسعود، اقبال کے بہت قریبی دوست تھے۔ جو اقبال سے بہت مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ اقبال نے بھوپال میں راس مسعود کے ہاں قیام بھی کیا۔ اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں جب انھیں بیماری کے ساتھ مالی مسائل بھی درپیش ہوئے تو سر راس مسعود نے اقبال کے وظیفے کے لیے بھی سرکار کو درخواست دی تھی۔ سر راس مسعود کا انتقال اقبال کی زندگی میں ہو گیا، جس کا انھیں بہت رنج ہوا۔ اس دکھ کا اظہار انھوں نے ممنون حسن خاں کو ۳۱ رجولائی ۱۹۳۷ء کو لاہور سے ایک خط میں اس طرح کیا:

''سید مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر، صبح اٹھتے ہی اخبار ''زمیندار'' سے معلوم ہوئی...... میرے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے۔''**(۲۱)**

اقبال نے اپنے مزار کے کتبے کے لیے ایک رباعی لکھ رکھی تھی لیکن وہ انھوں نے سر راس کی قبر کے لیے دیدی۔ ممنون حسن کے نام ایک اور خط ۷ اگست ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں:

''یہ رباعی میں نے اپنے کتبہ مزار کے لیے لکھی تھی لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے، حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔''**(۲۲)**

سر سید احمد خان کی ادبی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ اُردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی بھی سر سید ہی تھے۔ "Essay" انگریزی صنف ادب ہے، جو ہمارے ہاں یورپ سے آئی **(۲۳)**۔ مزید لکھتے ہیں:

''سر سید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا۔ اس کے عناصر ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہوں گے مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری سر سید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت انہی بنیادوں پر قائم ہے۔''**(۲۴)**

مولوی عبدالحق نے بھی سر سید احمد خاں کی خدمات کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

''سر سید اردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے۔ اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا لیکن علمی و ادبی اعتبار سے

بھی اردو زبان میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔''(۲۵)

سرسید کے خوابِ زریں کی تعبیر لانے میں جن لوگوں نے نسل در نسل کام کیا۔ان میں اقبال کا نام سرفہرست ہے۔سرسید کی نظر ماضی اور مستقبل دونوں پر بیک وقت تھی (۲۶)۔سرسید نے اپنی زندگی اور کارناموں سے قوم اور ملک کو جتنا متاثر کیا ہے۔اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ضیاءالدین لاہوری سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سرسید کو نظریہ پاکستان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کو یاد کرنے کا کوئی ایک انداز نہیں ہوسکتا۔ادب،صحافت،تعلیم،سیاست کے میدانوں میں انھیں ہر شخص اپنے ذوق اور حال کے مطابق یاد کرے گا۔''(۲۷)

سرسید کی فطرت میں متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی۔جس کی نسبت مسٹر آرنلڈ سرسید کی وفات کے بعد لاہور میں اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

''دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں مگر ان میں ایسے بہت کم نکلیں گے جس میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔وہ (یعنی سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق،تعلیم کا حامی،قوم کا سوشل ریفارمر،پولیٹیشن،مصنف اور مضمون نگار تھا۔''(۲۸)

مولانا الطاف حسین حالی ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ الہٰ آباد میں ایک جلسہ عام کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ کہے تھے،ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں۔تعلیم میں زیادہ ہیں تعداد میں زیادہ ہیں مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خان نہیں ہے۔بلکہ اگر ہم بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خان کے برابر نہیں ہو سکتے (۲۹)۔الغرض سرسید احمد خان اور علامہ اقبال دونوں اپنے اپنے دائرہ کار میں نامور شخصیات تھیں۔سرسید کے افکار اور مقاصد کو کامیاب صورت میں دیکھنا ہو تو اقبال کی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کو دیکھا جائے۔اقبال کے فکر وفن پر سرسید تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اقبال نے سرسید احمد خان کے مشن کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس پر اپنا منفرد رنگ چڑھا کر مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے سفر پر روانہ کیا۔برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا خواب سرسید نے دیکھا تھا۔یعنی دو قومی نظریے کے تحت ہندوؤں اور انگریزوں کی مخالفتوں کا سامنا کیا۔اور اپنی ساری کاوشوں اور صلاحیتوں کو اس مشن کے لیے وقف کر دیا لیکن زندگی نے زیادہ دیر ساتھ نہ دیا۔ان کی جدوجہد کا سفر جہاں ختم ہوا تھا وہاں سے اقبال کی جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔جسے انھوں نے اپنے زورِ قلم سے بخوبی سرانجام دیا۔ان دونوں کے شبانہ روز کاوشوں کا ثمر پاکستان کی صورت میں رونما ہوا۔جو اسلام کے نام پر ۲۷ رمضان المبارک بمطابق ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا۔اب یہ دنیا کا پہلا اسلامی ملک ہے جو ایٹمی طاقت بنا۔ان بزرگوں کا مشن کامیاب ہوا۔اب ہمارا فرض ہے کہ ہم نہ صرف اس امانت کو قائم رکھیں بلکہ اسے اسلام کا مضبوط قلعہ بنائیں۔یہی ان بزرگوں سے سچی محبت کا تقاضا ہے۔ایسی عظیم ہستیاں صدیوں بعد جنم لیتی ہیں۔بقول اقبال:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا(۳۰)

حوالہ جات

۱۔ نذیر نیازی، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں،(لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۱۲ء)،مرتبہ،ص۲۴

۲۔ ایضاً،ص۲۸۵

۳۔ عبادت بریلوی،اقبال کی اردو نثر،(لاہور:مجلسِ ترقی ادب)،نومبر۱۹۷۷ء،ص۲۷

۴۔ غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی و فکری ارتقا (سرگذشت اقبال)،(لاہور،بزم اقبال،۱۹۹۸ء)،ص۱۵۲

۵۔ افتخار احمد صدیقی،مولوی نذیر احمد دھلوی (احوال و آثار)،(لاہور:مجلسِ ترقی ادب،۲۰۱۲ء)،ص۲۳۰

۶۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)،(لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۹۴ء)،ص۶۷۸

۷۔ ایضاً،ص۳۶۸

۸۔ ایضاً،ص۶۰۸

۹۔ نذیر نیازی، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں،ص۲۸۵

۱۰۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)،ص۳۹۰

۱۱۔ جمیل جالبی،تاریخ ادب اُردو،جلد چہارم،(لاہور:مجلس ترقی ادب،فروری۲۰۱۲ء)،ص۸۹۱

۱۲۔ عطاءاللہ،شیخ، اقبال نامہ:مجموعہ مکاتیب اقبال،(لاہور:اقبال اکادمی،۲۰۱۲ء)،ص۱۸۸

۱۳۔ ایضاً،ص۱۳۳

۱۴۔ الطاف حسین حالی،حیاتِ جاوید،جلد دوم،(میر پور،ارسلان بکس،مئی۲۰۰۰ء)،ص۳۷۳

۱۵۔ محمد اسماعیل پانی پتی، مقالاتِ سرسید،حصہ اوّل(مذہبی و اسلامی مضامین)،(لاہور:مجلس ترقی ادب،اکتوبر۱۹۶۲ء)،ص۱

۱۶۔ نذیر نیازی، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں،ص۶۴

۱۷۔ نگار پاکستان،اقبال نمبر،شمارہ نمبر۱۱۔۱۲،۵۶واں سال،نومبر دسمبر۱۹۷۷ء،ص۲۰۳

۱۸۔ غلام رسول مہر،مطالب بانگِ درا،(لاہور:شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۶ء)،ص۵۳

۱۹۔ عطاءاللہ،شیخ، اقبال نامہ،ص۳۰۵۔۳۰۶

۲۰۔ ایضاً،ص۴۰۴

۲۱۔ ایضاً،ص۲۴۸

۲۲۔ ایضاً،ص۲۵۰

۲۳۔ سید عبداللہ، سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ،(اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۴ء)،ص۴۲

۲۴۔ ایضا،ص۲۵۱

۲۵۔ مولوی عبدالحق، حالات و افکار سرسیداحمدخاں،(کراچی:انجمن ترقی اُردو،۱۹۷۵ء)،ص۶۶

۲۶۔ انور سدید،اُردو ادب کی تحریکیں،(کراچی:انجمن ترقی اُردو،۲۰۰۴ء)،ص۳۴۸

۲۷۔ سرسیداحمدخاں، خودنوشت افکارِسرسید،(کراچی:فضلی سنز،۱۹۹۸ء)،مرتب:ضیاءالدین لاہوری،ص۱۷

۲۸۔ الطاف حسین حالی،حیاتِ جاوید،ص۲۲۸

۲۹۔ ایضاً،ص۲۲۶

۳۰۔ علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال،اُردو،ص۲۹۹